ضمیر اختر خان*

*پی ایچ ڈی اسکالر، شعبہ عربی و اسلامیات، پشاور یونیورسٹی۔ zamirakhtarkhan@yahoo.com

ایک ہمہ جہت شخصیت

اللہ تعالیٰ نے بشمول انسان کے تمام مخلوقات کے لیے موت کے حوالے سے اپنا ضابطہ قرآن مجید میں یوں بیان فرمایا ہے: کل من علیھا فان (سورۃ الرحمٰن:۲۶) کل نفس ذائقۃ الموت (سورۃ آل عمران:۱۸۵، سورۃ العنکبوت:۵۷)۔ جو یہاں آیا ہے، اسے بالآخر جانا ہے۔ ہمارے محترم اور نہایت ہی شفیق بزرگ جناب ڈاکٹر محمود احمد غازی رحمہ اللہ اسی الٰہی ضابطے کے تحت اپنی آخری منزل کی طرف چل دیے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

ڈاکٹر غازیؒ ایک ہمہ جہت شخصیت کے حامل انسان تھے۔ وہ بیک وقت ایک عالم دین، فقیہ، متکلم وخطیب، قانون دان، ماہر تعلیم، دانشور، مصلح اور اعلیٰ درجے کے منتظم تھے۔ اگرچہ انہوں نے عملی سیاست میں حصہ نہیں لیا، مگر بہت اچھی سیاسی بصیرت رکھتے تھے۔ ان سے میرا پہلا تعارف جولائی ۱۹۹۰ء میں ایک سیمینار کے دوران ہوا جس میں انہوں نے ''فرقہ بندی اور معاشرے پر اس کے اثرات'' کے موضوع پر نہایت مدلل اور پرجوش خطاب فرمایا تھا۔ میں نے تقریر کے اختتام پر منتظمین سے درخواست کی کہ اس خطاب کا کیسٹ مجھے مہیا کیا جائے۔ انہوں نے کمال مہربانی سے وہ کیسٹ مجھے عطا کیا جو آج بھی میرے پاس محفوظ ہے۔ میں نے متعدد بار اسے سنا اور اس کا عنوان اپنے طور پر بدل کر ''مسلمانوں میں فرقہ بندی کا افسانہ'' رکھ لیا اور بہت سے لوگوں کو استفادے کے لیے دیتا رہا۔ بعد ازاں اسی موضوع پر مولانا مناظر احسن گیلانی رحمہ اللہ کی کتاب بھی مجھے مل گئی جو اپنی جگہ جامع ہے، مگر جو انداز، دلائل اور جوش وجذبہ ڈاکٹر غازیؒ کے اس خطبے میں ہے، اس کی تاثیر بہت زیادہ ہے اور ابھی تک برقرار ہے۔

دسمبر ۲۰۰۳ء میں ہم نے ایک سیمینار منعقد کیا اور اس میں ایک بار پھر ڈاکٹر محمود احمد غازیؒ کو مدعو کیا۔ اب کی بار ان کا موضوع: Religious Motivation and Geostrategic Compulsions of Pakistan تھا۔ عنوان انگریزی میں ہونے کے باوجود اور خود انگریزی پر عبور رکھنے کے باوجود انہوں نے خطاب اردو میں کیا اور ایسا پرجوش خطاب کیا جس کی تازگی اور تحرک (Vibration) ابھی تک برقرار ہے۔ پرویزی حکومت میں وزیر مذہبی امور ہونے کے باوجود انہوں نے جس بے باکی سے عالم اسلام کے اتحاد اور پاکستان کے مسلم دنیا کے حوالے

سے کردار پر جذباتی انداز میں بات کی، اس نے ''سب سے پہلے پاکستان'' کے تصور کی دھجیاں اڑا دیں اور نہ صرف پرویزی فکر کے تار و پود بکھیر دیے بلکہ مجھ سمیت بہت سوں کو رُلا دیا۔ ان کے خطاب کا انداز بھی ہمیشہ منفرد ہوتا تھا۔ میں نے کبھی انہیں طویل تمہیدیں باندھتے نہیں سنا۔ حمد و ثنا کے فوراً بعد ہی موضوع پر جوشیلے انداز سے بولنا شروع کر دیتے تھے۔ ان کا ایک اور خطاب بعنوان ''اسلام میں تفریح کا تصور'' تقریباً تین گھنٹوں پر مشتمل میرے پاس ہے۔ اس میں جیسے ہی تعارفی کلمات کے بعد انہیں مدعو کیا گیا، انہوں نے فوراً موضوع پر بولنا شروع کر دیا اور مسلسل بولتے رہے اور ایک ہی رفتار و آواز سے بولتے گئے۔ انتہائی سنجیدہ گفتگو کرتے ہوئے کوئی ایسا ذو معنی جملہ بولتے کہ ہمہ تن گوش سامعین عین سنجیدگی کے عالم میں بے اختیار ہنس پڑتے۔

ڈاکٹر غازیؒ کی ایک اور انفرادیت یہ تھی کہ وہ علما کے درمیان جدید دانشور لگتے تھے اور جدید تعلیم یافتہ طبقے کے مابین علما کے ترجمان و حمایتی محسوس ہوتے تھے۔ وہ ہر طبقۂ فکر سے تعلق رکھنے والوں کو مطمئن کرنے کا ہنر جانتے تھے۔ کسی بھی موضوع پر انہیں اظہار خیال کی دعوت دی جائے، لگتا تھا جیسے اسی کے متخصص (Specialist) ہیں۔ تاریخ پر ان کی گہری نظر تھی۔ خاص طور پر مسلمانوں کے عروج و زوال کے اسباب سے بخوبی آگاہ تھے۔ ان کی ایک تقریر اس موضوع پر میرے پاس موجود ہے۔ اس میں انہوں نے بڑے خوب صورت انداز میں اہل ایمان کو متوجہ کیا ہے کہ وہ اپنی تابناک تاریخ سے روشنی حاصل کر کے اپنے حال کو سنواریں اور مستقبل کی منصوبہ بندی کریں۔ ان کی مسلسل کوشش تھی کہ مسلمانوں کو زوال کے اسباب سے آگاہ کیا جائے تاکہ ان کا سدباب کیا جا سکے۔ اندلس (Spain) کی تاریخ کا خاص طور پر حوالہ دیتے تھے جہاں مسلمانوں نے آٹھ سو سال تک شاندار طریقے سے حکومت کی اور عظیم الشان تہذیب و تمدن کی بنیادیں رکھیں۔ پھر وہاں سے ان کا صفایا کر دیا گیا۔ غازیؒ صاحب کے نزدیک حکمرانوں کو سب سے زیادہ تاریخ سے واقف ہونا چاہیے۔ وہ کہتے ہیں کہ تاریخ قوموں کا حافظہ ہوتی ہے، فرد اگر اپنا حافظہ بھول جائے تو اس کا مقام پاگل خانہ ہوتا ہے، اگر قوم اپنا حافظہ کھو بیٹھے تو اس کا کیا مقام ہونا چاہیے۔ قیادت پر فائز لوگوں کو تاریخ کا گہرا شعور ہونا چاہیے تاکہ قوم کی رہنمائی کا حق ادا کر سکیں۔ (تعمیر افکار، اکتوبر ۲۰۰۷ء ص ۲۵)

ڈاکٹر صاحب قلم کے بھی شہسوار تھے اور متعدد تحقیقی کتب کے مؤلف و مصنف تھے۔ آپ نے سو سے زیادہ علمی و تحقیقی مقالے مختلف کانفرنسوں میں پیش فرمائے جن میں سے اکثر ملکی و بین الاقوامی جرائد میں طبع ہو چکے ہیں۔ وقیع علمی و تحقیقی کتب کے علاوہ ان کی بعض کتب تو ان کے خطابات سے ہی مرتب کی گئی ہیں۔ ان میں سرفہرست محاضرات قرآنی، محاضرات حدیث اور محاضرات فقہ ہیں۔ یہ خطابات مستورات کے اجتماعات میں مختصر نوٹس کی مدد سے دیے گئے تھے مگر ان کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے غازی صاحبؒ کو علم سے وافر حصہ عطا فرمایا تھا۔ ڈاکٹر صاحب بنیادی طور پر فقہ اسلامی کے ماہر تھے لیکن ان کی بعض دوسری تحریریں ان کے فکر کی بلندیوں اور وسعتوں کی

گواہی دیتی ہیں۔ میرے سامنے اس وقت ان کی ایک ایسی ہی تالیف ہے جس سے ان کے فکر کی ہمہ گیری کا پتہ چلتا ہے۔ اس کا عنوان ہے: ''محکمات عالم قرآنی، علامہ اقبال کی نظر میں، قرآنی دنیا کی امتیازی خصوصیات اور اس کی بنیادیں (جاوید نامہ کی روشنی میں)''۔ یہ کتاب ڈاکٹر صاحب نے اپنی صاحبزادیوں کو املا کروائی تھی اور یہ معلوم ہے کہ املا کرانا اور الگ سے بیٹھ کر غور وخوض کر کے کسی موضوع پر لکھنے میں زمین وآسمان کا فرق ہوتا ہے۔ ان کی یہ مختصر مگر جامع تالیف ان کی وسعت مطالعہ کے ساتھ ساتھ علامہ اقبال کے فکر وفلسفے سے کماحقہ آگاہی کی بھی آئینہ دار ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ڈاکٹر غازیؒ صاحب کو بے پناہ ذہانت وفطانت سے نوازا تھا۔ میں نے جب بھی ان سے کوئی استفسار کیا یا کسی موضوع پر گفتگو کی، وہ فوراً اس کی تہہ تک پہنچ جاتے تھے۔ یہ کوئی تین چار سال پہلے کی بات ہے۔ وہ اسلامی یونیورسٹی، فیصل مسجد میں اپنے دفتر میں تشریف فرما تھے۔ میں ملاقات کے لیے حاضر ہوا۔ اثنائے گفتگو میں مغرب کا عالم اسلام کے ساتھ رویہ زیر بحث آیا تو فوراً مجھے اپنا ایک مضمون دراز سے نکال کر دیا جو ''تعمیر افکار'' کی اشاعت بابت ماہ اکتوبر ۲۰۰۷ء میں بھی چھپ چکا ہے۔ مضمون کا عنوان ہے ''اسلام اور مغرب۔ موجودہ صورت حال، امکانات، تجاویز''۔ یہ بھی آپ کی فی البدیہہ تقریر تھی جس کو صفحۂ قرطاس پر منتقل کر کے آپ کی نظر ثانی کے بعد شائع کیا گیا تھا۔ یہ مضمون مغربی دنیا کے حوالے سے آپ کی فکر کا نچوڑ ہے۔ اس کے ذریعے آپ نے بڑے جامع انداز سے مغرب کے مسلمانوں کے ساتھ رویے کا تجزیہ کیا ہے اور مسلمانوں کو مغربی طاقتوں کے عزائم سے خبردار کیا ہے۔ مغرب اور اسلام کی موجودہ کشمکش کا پس منظر بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''امت مسلمہ کے عالم گیر کردار میں یہ بات بنیادی طور پر شامل ہے کہ ان کا ایک طویل عرصے تک یہودیوں اور عیسائیوں سے واسطہ رہے گا، مقابلے کی نوعیت پیش آتی رہے گی، تصادم ہوتا رہے گا، اور اس تصادم کے لیے مسلمانوں کو یہ دو سورتیں (سورۃ البقرۃ، سورۃ آل عمران) تیار کر رہی ہیں''۔ (تعمیر افکار، اکتوبر ۲۰۰۷ء ص ۲۰)

موجودہ مغرب جس کا سرغنہ امریکہ ہے اور کبھی اس کا کرتا دھرتا برطانیہ تھا، ہر ایک کی رگ جاں پنجۂ یہود میں ہے۔ اس کے ڈانڈے بھی یہود ونصاریٰ کے آغاز اسلام کے طرز عمل سے ملتے ہیں۔ ڈاکٹر غازیؒ کے الفاظ میں:

''جس کو ہم مغرب کہتے ہیں، اس سے مسلمانوں کا مقابلہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور مبارک سے شروع ہو گیا تھا۔ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ہرقل کو نامۂ مبارک بھیجا۔ ہرقل مشرقی سلطنت روم کا فرماں روا تھا''۔ (تعمیر افکار، اکتوبر ۲۰۰۷ء ص ۲۰) گویا اس مخالفت کا اصل سبب دعوت اسلام بنی اور جب خلافت راشدہ کی صورت میں اسلام کا عادلانہ نظام اپنی بہاریں دکھانے لگا تو اس مخالفت میں اضافہ ہو گیا، کیونکہ قیصر کی خدائی خطرے میں پڑ گئی تھی۔ اب کبریائی وخدائی صرف اللہ کا حق تھا۔ سارے انسان اللہ کی نیابت (خلافت) کے تو حقدار ہو سکتے ہیں، لیکن خدائی منصب کسی کو نہیں مل سکتا۔ اس کی عملی شکل خلافت راشدہ کے زمانے میں سامنے آئی تو بندوں پر خدائی کا دعویٰ رکھنے

والے خم ٹھونک کر میدان میں آ گئے۔ مسلمانوں نے ان کا مقابلہ میدان جنگ میں کیا۔ غازیؒ صاحب لکھتے ہیں:

''اس کے (یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے) بعد اصل تصادم اور مقابلہ خلفائے راشدین کے زمانے میں ہوا۔ صلیبی جنگوں کے بعد ایک طویل عرصے تک اسپین میں یہ مقابلہ جاری رہا، جنوبی یورپ کے ذریعے یہ سابقہ پیش آتا رہا۔ پھر استعمار اور ایسٹ انڈیا کمپنیوں کے ذریعے ہوا۔ اس کے بعد گزشتہ سو سال سے جو کچھ ہو رہا ہے، وہ بھی ہمارے سامنے ہے''۔ (تعمیر افکار، اکتوبر ۲۰۰۷ء ص ۲۰)

ڈاکٹر صاحب مرحوم کو شدید احساس تھا کہ مغربی دنیا اور اقوام متحدہ جیسے نام نہاد عالمی ادارے مسلمان ملکوں کو بالعموم اور پاکستان کو بالخصوص اپنے مفادات کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''جب گورے کی ہدایت آتی ہے کہ قیام امن کے لیے فلاں جگہ فوج بھیجو اور مسلمانوں کی بندوقوں کے ذریعے مسلمانوں کو زیر کر کے ہمارے مفادات کے لیے راہ ہموار کرو، تو تیمور میں بھی فوج چلی جاتی ہے، صومالیہ میں بھی چلی جاتی ہے اور ایری ٹیریا میں بھی چلی جاتی ہے۔ دنیائے اسلام کے سپاہیوں کے ذریعے، دنیائے اسلام کی بندوقوں کے ذریعے، دنیائے اسلام کے مسلمانوں کی تلواروں کے ذریعے مسلمانوں کی گردنیں کاٹی جائیں، اور ان کو کاٹ کاٹ کر عیسائی اور مسیحی ریاستیں قائم کی جائیں۔'' (تعمیر افکار، اکتوبر ۲۰۰۷ء ص ۲۴)

انگریزوں کے گن گانے والوں کو آئینہ دکھاتے ہوئے کہ ان کے ممدوح کتنے مہذب اور انسان دوست تھے، لکھتے ہیں:

''انیسویں صدی کے آغاز میں مسلمانوں میں پنجاب میں سو فیصد تعلیم تھی اور بحیثیت مجموعی ۸۴ فیصد تھی اور جب انگریز ۱۹۴۷ء میں ہندوستان سے گیا تو پنجاب میں مسلمانوں میں تعلیم کا تناسب ۴ فیصد تھا۔ انگریز سو کو چار پر لے آئے اور پوری قوم کو جاہل چھوڑ کر چلے گئے۔ یہ ہے اس دعوے کی حقیقت جو کہا جاتا ہے کہ مغربی ممالک کا ایک سویلائزنگ رول تھا۔ آج بھی ہمارے ہاں بہت سے سادہ لوح اور مشرق بے زار لوگ کہتے ہیں کہ انگریز نے ہمیں سویلائز کر دیا۔ یہ سویلائز کیا کہ سو فیصد تعلیم کو سو فیصد جہالت میں بدل دیا''۔ (تعمیر افکار، اکتوبر ۲۰۰۷ء ص ۲۶)

ڈاکٹر صاحب مرحوم نے اپنا ایک سبق آموز واقعہ بیان کیا ہے جس سے مغربیوں کے سازشی کردار کی عکاسی ہوتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''اکتوبر ۱۹۷۴ء میں ایک پروفیسر صاحب امریکہ سے تشریف لائے۔ وہ ایک مشہور امریکن یونیورسٹی میں پروفیسر تھے۔... وہ پروفیسر صاحب بہت سے لوگوں سے ملے، مجھ سے بھی ملے۔ مجھ سے ملنے کے بعد انہوں نے کہا کہ میں الگ سے گفتگو کرنا چاہتا ہوں، تم مجھ سے ملنے کے لیے آؤ۔ میں ان سے ملنے چلا گیا۔ دوران ملاقات انہوں نے کہا، امریکہ میں پی ایچ ڈی کرنے کے لیے تم جس یونیورسٹی میں چاہو، میں تمہیں اسکالرشپ دے سکتا ہوں۔... میں نے کہا، مجھے ہارورڈ میں داخلہ دلوا دیں۔ انہوں نے کہا ٹھیک ہے۔... تم ایک سال کے لیے امریکہ آؤ، ہارورڈ یونیورسٹی میں کورس ورک کرو۔... پھر واپس پاکستان آ جاؤ۔ انہوں نے جو نقد وظیفہ بتایا، وہ اتنا تھا جتنا اس وقت حکومت پاکستان کے سیکرٹری کو بھی تنخواہ نہیں ملتی تھی۔... انہوں نے بتایا کہ پاکستان میں رہ کر یہ معلومات جمع کرو کہ پاکستان

میں دینی مدارس کیا کام کرتے ہیں، کتنے دینی مدارس ہیں، کون کون علمائے کرام ان کو چلا رہے ہیں، وہ کیا کیا پڑھاتے ہیں، کیا ذہن بناتے ہیں اور جو لوگ ان سے تیار ہوتے ہیں، وہ بعد میں کیا کام کرتے ہیں، ان کا رویہ مغرب کے بارے میں کیسا ہوتا ہے؟ یہ ساری معلومات جمع کر کے آؤ، پھر میرے ساتھ بیٹھ کر اس کو مرتب کرو، اس کی بنیاد پر تمہیں ہارورڈ یونیورسٹی پی ایچ ڈی کی ڈگری دے دے گی''۔ (تعمیر افکار، اکتوبر ۲۰۰۷ء ص ۳۳)

غازی صاحبؒ نے جس خوبصورتی سے مغرب کی مسلمانوں کو گمراہ کرنے کی تدابیر کا ذکر کیا ہے، وہ انھی کے ذہن رسا سے ہی ممکن تھا۔ اللہ تعالیٰ انہیں اجر عظیم سے نوازے۔ آمین۔

غازیؒ صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں مسلمانوں کو بھی جھنجھوڑا ہے کہ وہ کھوکھلے نعروں سے اسلام کو بدنام کرتے ہیں۔ اس حوالے سے اپنے دورۂ ازبکستان کا ذکر کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''۱۹۹۰ء میں مجھے ازبکستان جانے کا موقع ملا۔ ... میں نے صدر ازبکستان سے کہا کہ ... آپ ازبک نوجوانوں کو ہمارے تعلیمی اداروں میں آنے کی اجازت دیں۔ صدر صاحب مسکرائے اور انہوں نے کسی سے اپنی زبان میں کچھ کہا اور اس نے ایک موٹی سی فائل لا کر صدر کے سامنے میز پر رکھ دی۔ صدر صاحب نے وہ فائل میری طرف لڑھکا دی۔ میں نے فائل کو کھولا تو اس میں اخبارات کے تراشے تھے اور ہمارے پاکستان کے بہت سے مذہبی، دینی سیاسی قائدین کے بیانات تھے کہ ہم فلاں جگہ جھنڈا لہرا دیں گے اور سمرقند و بخارا کو آزاد کرا دیں گے ... جب میں اس فائل کی ورق گردانی کر چکا تو صدر ازبکستان کہنے لگے کہ تم یہ سب کرنے کے لیے طلبہ کو لے جانا چاہتے ہو؟ سچی بات یہ ہے کہ ... میرے پاس سوال کا جواب نہیں تھا''۔ (تعمیر افکار، اکتوبر ۲۰۰۷ء ص ۳۴)

متذکرہ بالا اقتباسات سے عیاں ہے کہ غازیؒ صاحب محدود معنی میں معلم و مدرس ہی نہیں تھے بلکہ عالمی حالات کا گہرا شعور بھی رکھتے تھے۔ طوالت سے بچتے ہوئے مغرب کے چند جرائم کا ذکر کرنا ضروری ہے جن کو وہ عالم انسانیت کے لیے انتہائی خطرناک سمجھتے تھے۔ مثلاً عالمگیریت (Globalization) کو وہ مسلمانوں کے وسائل پر قبضے اور ان کے تشخص کو مٹانے کا ایک منصوبہ خیال کرتے تھے۔ مزید برآں وہ عالمگیریت کو انسانوں کے درمیان تفریق و تقسیم کا آلۂ کار گردانتے تھے۔ ان کی یہ پختہ رائے تھی کہ اہل مغرب کو اسلام کے حوالے سے کوئی غلط فہمی یا مغالطہ نہیں ہے، بلکہ یہ ان کا سوچا سمجھا منصوبہ ہے کہ اسلام و مسلمانوں کی مخالفت کر کے وہ دنیا کی توجہ اسلام سے ہٹانا چاہتے ہیں کیونکہ وہ دیکھ رہے ہیں کہ مستقبل اسلام کا ہے۔ مغرب کے متعصّبانہ رویے کے باوجود اسلام وہاں تیزی سے پھیل رہا ہے۔ خاص طور پر طبقہ خواتین اسلام کی طرف زیادہ رجوع کر رہا ہے۔

غازیؒ صاحب کی زندگی کا ایک اور پہلو بھی قابل توجہ ہے۔ آپ اپنی تعلیمی و تدریسی مصروفیات کے باوجود جس طرح تصنیف و تالیف کا کام بھی جاری رکھتے تھے، یہ آپ ہی کا خاصہ تھا۔ ان ہمہ جہتی مشاغل کے باوجود طبیعت میں ہمیشہ بشاشت ہوتی تھی۔ دگرگوں حالات میں بھی پرامید (Optimistic) ہوتے تھے۔ عالم اسلام کے حوالے سے

کسی اندیشے میں مبتلا ہونے کی بجائے وہ ہمیشہ روشن مستقبل کی بات کرتے تھے۔

آپ سماجی ومعاشرتی تعلقات کا کتنا خیال رکھتے تھے، اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اسلامی یونیورسٹی میں اعلیٰ منصب پر فائز ہونے کے باوجود اپنی بیٹی کی دل جوئی کے لیے اس کی سہیلی کی مہندی کی رسم میں ایک دفعہ شرکت کے لیے چلے گئے۔ یہ اور بات ہے کہ وہاں پر جو ہندوانہ خرافات ورسومات دیکھیں تو ان پر بعد میں اپنی تقریر کے دوران تأسف کا اظہار بھی کیا اور کھل کر اس ہندوانہ ثقافت کی مخالفت کی اور برملا اعتراف بھی کیا کہ اس سے پہلے وہ اس قسم کی رسوم کو محض سماجی Gatherings سمجھتے تھے، لیکن متذکرہ محفل میں انہوں نے دیکھا کہ نوجوان لڑکے لڑکیاں پیلے کپڑے پہنے، ہاتھوں میں گیندے کے پھول اٹھائے ہوئے اور عجیب وغریب انداز سے الٹی سیدھی حرکتیں کرتے ہوئے محفل میں نمودار ہوئے تو وہ سخت پریشان ہوئے اور آئندہ کے لیے ایسی محافل میں شرکت نہ کرنے کا عزم کیا۔ ان کی مخالفت اور تنقید کا انداز بھی بہت پیارا ہوتا تھا۔ مثلاً انسانی حقوق کے حوالے سے مغرب کے دہرے معیار پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ Dignity of man کی باتیں کرنے والوں کو اسلام کے قانون قصاص پر بڑا اعتراض ہے کہ اس میں ایک جان ضائع ہو جاتی ہے۔ خود کسی سے انتقام لینا ہو تو بستیوں کی بستیاں تاراج کر لیں گے، لیکن قصاص میں ایک انگلی کے کٹنے پر یہ شور برپا کر دیتے ہیں۔ (روایت بالمعنی)

ڈاکٹر صاحب حلم وعمل کے ساتھ ساتھ ایک اعلیٰ پایے کے منتظم بھی تھے۔ آپ نے اپنی انتظامی صلاحیتوں کا بہترین استعمال کیا۔ یوں تو دعوۃ اکیڈمی، شریعہ اکیڈمی اور دیگر اداروں کے انتظام وانصرام باحسن طریق انجام دیے، مگر اسلامی یونیورسٹی کے وائس چانسلر کی حیثیت سے آپ نے جس نظم ونسق کا طلبہ واساتذہ کو پابند بنایا اور ایک مثالی تعلیمی ماحول قائم کیا، وہ قابل ستائش ہی نہیں قابل تقلید بھی تھا۔ عام طور پر ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ کو صرف ایک دینی سکالر اور ماہر تعلیم سمجھا جاتا ہے لیکن فی الواقع وہ اس سے کہیں زیادہ تھے۔ وہ ایک مجتہد وفقیہ ہونے کے علاوہ ایک مصلح کی سی شان کے حامل بھی تھے۔ ان کی بہت ہی پختہ رائے تھی کہ اسلام کے عادلانہ نظام کے اندر انسانیت کے تمام دکھوں کا مداوا موجود ہے اور آج اگر اس نظام عدل وقسط کو دنیا میں قائم کر کے دکھا دیا جائے تو دنیا اسلام کی طرف لپک پڑے گی اور باطل نظاموں کے مظالم میں گھری ہوئی انسانیت سکھ کا سانس لے سکے گی۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''عالم قرآنی یا قرآنی دنیا سے مراد انسانی زندگی کا وہ ڈھنگ ہے جو قرآن مجید کی تعلیم وہدایات پر استوار ہو۔ گذشتہ تین صدیوں سے اسلامی ادبیات اور اسلامی فلسفہ سیاست وقانون کا سب سے اہم موضوع یہی رہا ہے کہ اس مثالی دنیا کو از سر نو دریافت کیا جائے جو ہر مسلمان کے دل کی آواز ہے، جو مشرق ومغرب کے اہل ایمان کے لیے ایک ایسے آئیڈیل کی حیثیت رکھتی ہے جس کے حصول کی خاطر نہ معلوم کتنی نسلیں قربانیاں دیتی چلی آ رہی ہیں۔ نہ معلوم کتنی سعید روحیں اس ہدف کے حصول میں جانوں کا نذرانہ پیش کر چکی ہیں۔ نہ معلوم کتنے اہل علم ودانش کے شب وروز اس عالم

منتظر کی تفصیلات پر غور وخوض کرنے میں صرف ہوئے ہیں۔ یہ عالم قرآنی دنیائے اسلام کی وہ منزل ومقصود ہے جس تک پہنچنے کے لیے لاکھوں نہیں کروڑوں انسانوں نے جان ومال کی بازیاں لگائی ہیں۔ مسلم سیاسی مفکرین نے حکومت الہیہ، خلافت ربانی، اسلامی حکومت اور اسلامی ریاست کے عنوانات کے تحت اسی جہان مطلوب کے چہرے سے نقاب اٹھانے کی کوشش کی ہے۔ فقہائے اسلام نے نفاذ شریعت اور فقہ اسلامی کی تدوین نو کے موضوعات پر جو کچھ لکھا ہے وہ اسی ہدف کو پیش نظر رکھ کر لکھا ہے۔ احیائے اسلام اور ملت اسلامی کی نشأۃ ثانیہ کے لیے گزشتہ چند صدیوں میں جو کاوشیں ہوئی ہیں ان کی منزل مقصود بھی ایک ایسی دنیا کی تشکیل تھی جہاں قرآن مجید اور اسوہ رسولؐ کو سامنے رکھ کر انفرادی اور اجتماعی زندگی کے اسلامی ڈھنگ اپنائے جاسکیں''۔ (محکمات عالم قرآنی صفحہ ۴، ۵)

ڈاکٹر صاحبؒ نے علامہ اقبال کے حوالے سے عالم قرآنی کے چار محکمات کا ذکر کیا ہے یعنی ''خلافت آدم، حکومت الٰہی، زمین ملک خدا ہے اور حکمت خیر کثیر ہے''۔ (محکمات عالم قرآنی صفحہ ۲۱) اسلام کے عادلانہ نظام، جس کو وہ عالم قرآنی کہتے ہیں، کے قیام کا خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہوسکتا جب تک علم الادیان اور علم الابدان کی دوئی کو ختم نہیں کیا جاتا۔ اس ضمن میں ان کا موقف یہ تھا کہ دینی و مذہبی علوم، علم وحکمت کی اساس ہیں، لیکن ان کے ساتھ ساتھ علم وحکمت کے دائرے میں علم اسماء وعلم تجربی (Modern Scientific Knowlege) بھی شامل ہیں۔ علوم وفنون کی یہ وحدت اسلام کے تصور علم کی بنیاد ہے۔ تعلیم میں دوئی سے فکر ونظر میں دوئی پیدا ہوتی ہے اور فکر ونظر میں دوئی سے اس وحدت فکر وعمل پر زد پڑتی ہے جو عقیدۂ توحید کے لازمی نتیجے کے طور پر امت مسلمہ میں قائم رہنی چاہیے۔

ڈاکٹر غازیؒ کی فکری پختگی کا مظہر ان کی مغرب کے بارے میں منفرد رائے ہے۔ وہ مغربی تہذیب کو Secular کی بجائے مسیحی کہتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''ہمارے ہاں بہت سے حضرات سادہ لوحی سے مغرب کا مطالعہ کرتے ہیں اور مغرب کے ظاہری دعووں سے متاثر ہو جاتے ہیں۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ مغرب نے مذہب کو گھر سے نکال دیا ہے اور اب مغرب ہر مذہبی تعصب سے آزاد ہے۔ وہ حضرات یہ بھول جاتے ہیں کہ مغرب نے مذہب کو ایک خاص علاقے سے نکالا ہے، گھر سے نہیں نکالا۔ مغرب کی ہر چیز عیسائی تہذیب وتمدن، عیسائی روایات اور عیسائی تعصبات پر مبنی ہے''۔ (تعمیر افکار، اکتوبر ۲۰۰۰ء، ص ۲۱)

ڈاکٹر محمود احمد غازی رحمہ اللہ کی زندگی کے یہ وہ پہلو ہیں جن کا کسی درجے میں راقم الحروف کو علم تھا۔ آئندہ کوئی صاحب عزم وہمت ان کی زندگی پر تحقیق کر کے ان کی شخصیت کے مزید پہلوؤں کو اجاگر کرسکتا ہے۔ ایسی نابغۂ روزگار شخصیات کے بارے میں آگاہی آنے والی نسلوں کے لیے رہنمائی کا کام دے گی۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کی دینی خدمات کو شرف قبولیت سے نوازے اور ہم سب کو ان کا ساجذبہ اور اخلاص عطا فرمائے۔ جس لگن ومحنت سے انہوں نے دین وملت کی خدمت کا فریضہ بحسن وخوبی انجام دیا، اللہ ہمیں اس میں سے کچھ حصہ نصیب فرمائے۔ اللھم اغفرلہ وارحمہ وحاسبہ حسابا یسیرا۔ آمین یا رب العلمین۔